سب رنگ کی منتخب کہانیاں اردو ادب کا عطر قیمت
اس شمارے کے لیے اردو کا ایک خیال انگیز مثالی آفریں تحریر

رویا

ایک بت طناز، شاہ لقا، کا افراد کا قصہ
کچھ دیر کے لیے کرنل محمد خاں کے حوالے

پروفیسر اعجاز حسین جنھیں ہم چچا کہتے ہیں کوئی ساٹھ برس کے پیٹے میں ہیں لیکن کبھی جوان بھی تھے اور جوان بھی ایسے رعنا خوب رو اور خوش پوش کہ جس بستی سے گزر جاتے وہاں کے حسینوں میں مدتوں ہل چل رہتی۔ اُن کے شباب کا ایک قصہ بڑی شہرت حاصل کر چکا تھا یعنی اُن کا اور ایک ہندو لڑکی موتیا کا رومان۔ ہمیں ارمان تھا کہ یہ داستان ہم خود چچا کی زبانی سنیں کہ وہ غضب کے داستان گو بھی تھے اگرچہ بظاہر کم گو تھے۔ ایک دن چچا خلاف معمول موج میں تھے۔ ہمیں شرارت سوجھی چچا سے کہا: "چچا! آپ کی موتیا کا قصہ تو کچھ فرضی سا لگتا ہے۔ وہ ہندو تھی آپ مسلمان، اپنوں کو چھوڑ کر اُس کی آنکھ بھرے شہر میں آپ ہی سے کیوں لڑی؟"

عام حالات میں چچا ایسے سوال گول کر جاتے تھے لیکن آج کا سوال صرف سوال ہی نہیں چیلنج بھی تھا، چچا بول اُٹھے: "برخوردار! اگر بھرے شہر میں موتیا کی آنکھ ہم سے لڑی اور ہماری موتیا سے تو اس کی ایک خاص وجہ تھی اور وہ یہ کہ ہم دونوں کے سوا بھرے شہر میں کسی کو آنکھ لڑانے کا سلیقہ ہی نہ تھا۔"

"لیکن اتنا بڑا سنگین واقعہ کب اور کیسے ہوا؟" ہم نے سراپا اشتیاق بن کر پوچھا۔

چچا کی طبیعت آج بلاشبہ رنگ پر تھی۔ ایک سکون بخش کش کے بعد حقے کی نے ایک طرف کرتے ہوئے بولے: "بھئی! قصہ تو ہم سناتے ہیں لیکن درمیان میں گفتگو اس طرح کہانی میں روانی نہیں آتی۔"

ہم تینوں شنوندگان یعنی نعیم نیاز اور میں نے بہ صمیم قلب خاموش رہنے کا اقرار کیا اور چچا نے داستان کا آغاز کیا: "یہ قیام پاکستان سے تقریباً ایک سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ہم نے تازہ تازہ ایم اے پاس کیا تھا اور ایک انٹرمیڈیٹ کالج میں لیکچرر مقرر ہو گئے تھے۔ یہ کالج سرکار نے ایک پس ماندہ علاقے کی اشک شوئی کے لیے ایک دُور ماندہ سے قصبے بالا پور میں کھول رکھا تھا جہاں پہنچنے کے لیے تہذیب اور فیشن کو گاڑی سے اُتر کر کئی میل پیدل چلنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کے دوشیزگان بے تماشا سینوں پر پھیلے ہوئے تھے اور ایک قمیص کی کشادگی میں سارا کنبہ سما سکتا تھا۔ سارے شہر میں کوئی ایسا دوپٹہ نہ تھا جو کسی مرمریں گردن میں حمائل ہو یا کوئی ایسی قمیص جو کسی سیمیں کمر میں پیوست ہو۔"

"رہے مرد تو پہلی نگاہ پر مون جو ڈارو کے مہاجر نظر آتے تھے۔ سنا کہ ہمارے کالج کے اکثر استادوں کا بھی ایک پاؤں ابھی پتھر کے زمانے ہی میں تھا۔ فقط پرنسپل صاحب جو ولایت سے ہو آئے تھے، رنگ ڈھنگ دُنیا دیکھ چکے تھے لیکن سکھ ہونے کی وجہ سے آنکھ لڑانا اُن کے مشاغل میں سے نہ تھا۔ کم از کم بالا پور میں ہمارے مقابلے میں اُن کی رقیبانہ حیثیت بے کار تھی۔ کچھ یہ بھی کہ پانچ بچوں کے باپ تھے اور اُن کے غنچہ ہائے اُمید کھل چکے تھے۔ اِدھر ہم خود بچے تھے اور ہمارے گلوں میں ابھی رنگ بھرنا باقی تھا۔"

"ہم سیدھے لاہور سے ایم اے اقتصادیات کر کے آئے تھے۔ اقرار کرنے کے باوجود ہم اقتصادیات کا تو کچھ نہ بگاڑ سکے لیکن ہماری نفاست طبع نے فیشن کے نصیب سنوار دیے۔ چناں چہ اقتصادیات میں تو ہماری شہرت نے کبھی گھر کی چار دیواری سے باہر نہ جھانکا لیکن ملبوسات کی دُنیا میں ہمارا ذکر اُن درباروں تک پہنچ گیا جہاں تک ہم خود نہیں پہنچ پاتے تھے۔ اہل بالا پور کی آنکھیں ہم نے پہلے ہی روز خیرہ کر دیں۔ ہم جب بھی اپنے مکان سے نکلتے، بالا پور کے لوگ ہمیں اور ہمارا ملبوس دیکھنے کے لیے

Https://www.facebook.com/groups/3726056771789 45/

محمد خاں، ریٹائرڈ کرنل پاکستانی فوج کے لیے ایم اے [illegible] ایجوکیشن افسر، بحیثیت [illegible] بہ سلامت روی، بزم آرائیاں اور بیاض [illegible] کے مصنف خوش رنگ، خوش آہنگ کرنل محمد خاں انھیں قلم اور کورٹ کے مصنف کرنل مسعود نے ایک مزاح نگار کی حیثیت سے متعارف کروایا تھا۔

دیکھتے دیکھتے کرنل محمد خاں نے اُن کو چوں میں اپنے بے شمار وارفتہ، والہ و شیدا پیدا کیے بزمِ محفل میں جیسے یکسانی کی کمی تھی۔ کرنل صاحب نے اپنا شیش محل اپنی بنیادوں پر اُٹھایا ہے۔ شگفتگی و شائستگی، خندگی و شگفتگی، اُن کی شرارتوں میں کمال کی شرافت ہے۔ وہ اپنے قارئین پر پھول بکھیرتے، رنگ بکھیرتے بے خبر بے نیاز آگے گزر جاتے ہیں۔ بازگشت دیر تک اور دُور تک گونجتی رہتی ہے۔ ابوالخیر کشفی کے کہنے کے مطابق اگر کوئی کسی سخن آشنا سے سوال کرے، اردو کے وہ کون سے سخن طراز ہیں جو اپنے قارئین کو ایک آنکھ زلاتے ہیں، ایک آنکھ ہنساتے ہیں تو وہ کسی تامل و تردد کے بغیر جواب دے گا: شفیق الرحمان اور کرنل محمد خاں۔

موتیا دیکھیے، کرنل کے قلم و فصاحت، رقم، کلام پر [illegible] کا ایک خوش پارہ۔ اس تحریر میں بیان کا حسن ہے اور خیال کی چمک۔ ان کہانیوں کا سینہ کتنے خار و خس کا ذخیرہ ہے۔ یہ کچھ انھی سے پوچھیے، کون جانے، کہانی کے چچا اعجاز حسین کا کردار محمد خاں سے بالا ہی بالا کیوں [illegible]

اُن جاتے اور ہم نظریں جھکائے خلق خدا سے خراج وصول کرتے گزر جاتے
ادھر اُدھر ہمیں دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ کچھ دیکھنے ہی کو نہ تھا۔ ہو سکتا تھا
اسی مقامی گدڑی میں بھی کوئی لعل ہو لیکن کون گدڑی کھولتا اور لعل ڈھونڈتا۔
مگر ایک دن اور وہ کس قدر تقدیر ساز دن تھا، ہم نے مکان سے نکل کر
گلی میں قدم رکھا ہی تھا کہ ہمارے سامنے سے ایک بے گدڑی کا لعل گزرا،
گدڑی کی جگہ دھانی شیفون کا دوپٹا، ایک مختصر سی ریشمی شلوار اور مختصر
سی قمیص اور تین کپڑوں کے اندر ایک سرو قامت اور مرطعت لعل!
اس نے گزرتے ہم پر ایک غلط انداز سی نگاہ ڈالی اور بس ایک ہی نگاہ میں
ہماری یکتائی کا خاتمہ کر دیا۔ ہمیں محسوس ہوا کہ بے شک بالا پور میں ہمارے
والی اور بھی ہے اور ہمی اس قصبے کے لاشریک خراج گیر نہیں۔"

ہم نے اپنے نوکر راجو سے پوچھا۔ وہ دیہاتی عشق بازوں کی زبان
اس کہنے لگا: "نیا مال ہے۔ لاہور یا دلی سے آیا معلوم ہوتا ہے۔" راجو ہمارا
راز دار تھا اور بچپن کا ساتھی بھی لہٰذا بے تکلف تھا۔

خدا جانے اُس روز ہم کیوں دن بھر بے قرار سے رہے۔ پچھلے پہر
ہمارا راجو یہ معلوم کر کے لایا کہ لڑکی ہندو ہے اور نام اُس کا فرہ کا موتیا ہے تو
ہماری بے قراری کو قطعاً افاقہ نہ ہوا۔

دوسرے روز ہم کالج سے واپس آ رہے تھے کہ سامنے سے پھر وہی
بُت طناز آتا دکھائی دیا۔ اب کے نہ صرف آسمانی رنگ کا سوٹ زیب تن تھا
بلکہ اُس کا سراپا ہی افلاکی نظر آتا تھا۔ مقابلے میں یوں محسوس ہوا کہ ہم اپنے
ایم اے اور فیشن کے باوجود محض ارضی قسم کی نباتات ہیں۔ یعنی از قسم شلغم و
گندہ۔ پاس سے گزرتے ذرے ہمیں دیکھا بھی لیکن نہ اُن گلابی ہونٹوں میں جنبش
پیدا ہوئی نہ اُن شرابی آنکھوں نے پیغام دیا۔ مفت میں راہ چلتے ہمارا صبر و
قرار لُٹ گیا۔

جب یوں بیٹھے بٹھائے ہمیں بیماری دل نے آ لیا اور راجو نے
ہمارا کام تمام ہوتے دیکھا تو بے چارہ وفا کا مارا سرہانے بیٹھ گیا اور ہمارا
درد دل بٹانے لگا لیکن جب اُسے یقین ہو گیا کہ ہماری زندگی اُسی مسیحا
نفس کی محتاج ہے تو کسی نہ کسی طرح اُس تک پہنچنے کی ترکیبیں سوچنے
لگا اور اسی تگ و دو میں ماسی مہرو تک جا پہنچا۔ ماسی مہرو سارے شہر
کی خالہ تھی اور کہا جاتا تھا کہ سارے شہر کا درد اُس کے جگر میں ہے۔ گویا
ایک معزز شہری ہونے کے اعتبار سے ماسی مہرو کی کسی رگ میں ہمارے درد
کا شائبہ بھی تھا۔ راجو نے اپنے زعم میں ماسی کی اُسی رگ پہ جا ہاتھ رکھا کیوں
کہ واپس آیا تو خوشی سے ناچ رہا تھا۔ بولا: "ماسی سب مشکلیں آسان کر
دے گی۔"

راجو ہمارا غم خوار ضرور تھا اور بظاہر خیر بھی اچھی لایا تھا مگر سادہ
لوح تھا۔ ہمیں خدشہ ہوا کہ ماسی ہماری عاشقانہ بدحالی کا قصہ سُن کر اسے
عام نہ کر دے۔ ہم عشق بھی کرنا چاہتے تھے اور حجاب میں بھی رہنا چاہتے تھے

چناں چہ کسی قدر تشویش کے ساتھ راجو سے پوچھا: "راجو! ماسی کے سامنے ہمارے عشق سے زیادہ پردہ تو نہیں اٹھایا؟"

"نہیں بادشاہو! میں نے تو آپ کا نام ہی نہیں لیا۔ صرف اتنا پوچھا تھا کہ ماسی! یہ جو ہندو لڑکی ہے نا موتیا! یہ کیسی لڑکی ہے؟"

ہم نے راجو کے سوال پر غور کیا تو محسوس ہوا کہ اس سوال سے ہمارے وقار کو تو کوئی آنچ نہ آسکے گی لیکن موتیا کے ہاں ہمارا نام بھی رجسٹر نہیں ہوگا۔ ہم نے کہا: "راجو! تمہارا سوال ہے تو ڈپلومیٹک لیکن اس سوال میں ہم کہاں ہیں؟ ماسی تو یہ سمجھے گی کہ یہ سوال ہماری خاطر نہیں رفاہ عامہ کے لیے پوچھا گیا ہے اور بالفرض وہ جواب دے آئی کہ موتیا ایسی نہیں ویسی لڑکی ہے تو اس کا ہمیں کیا ثواب ملے گا؟" راجو نے کچھ سمجھ کر سر ہلایا، گویا کتنا ہو "صفر"۔

"لہٰذا راجو میاں!" ہم نے کہا: "کوئی ایسی ترکیب نکالو کہ ماسی پر ہمارا حال دل بھی واضح ہو جائے لیکن زیادہ تہ تک بھی نہ پہنچ سکے۔"

راجو جھٹ بولا: "تو موتیاں والیو پھر بذریعہ ڈاک عشق کرو۔" راجو ہم سے دل لگی بھی کر لیتا تھا۔

ہم نے کہا: "دیکھو راجو! یہ ہنسی کا مقام نہیں۔ جاؤ اور بذریعہ ماسی ہی ہماری خاطر ایک ضمنی سوال کر آؤ۔"

راجو اس دوسری مہم پر جاتے ہوئے بہت خوش نہ تھا لیکن لوٹا تو ہنستے ہنستے کہنے لگا: "ماسی مہرو کے ساتھ وکیلوں کی سی چال چلی ہے۔"

"مثلاً کیسے؟"

"میں نے کہا: ماسی! دوسری بات یہ ہے کہ خدا جانے ہمارے پروفیسر صاحب ہر وقت موتیا کی تعریف میں شعر کیوں پڑھتے رہتے ہیں۔"

کیا غضب کا سوال کیا تھا راجو نے! ہمیں محسوس ہوا کہ اب راز محبت اور عزت سادات دونوں محفوظ ہیں لیکن یہ نہ سوچا کہ ہم اقتصادیات کے ایم اے ہیں تو ماسی عشقیات کی پی ایچ ڈی ہے۔ وہ تو راجو کی شکل دیکھ کر ہمارے دل کا بھید پا گئی تھی۔

دوسرے روز ہم گھر کے صحن میں بیٹھے تھے کہ ماسی مہرو دروازے سے داخل ہوئی۔ راجو اتفاق سے گھر میں موجود نہ تھا۔ اس سے پہلے ہماری نگاہیں ماسی سے چار ضرور ہوئی تھیں لیکن ہم کلامی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ماسی کچھ کہنے کو بے تاب تھی لیکن ہم سے براہ راست بات کرنے سے جھینپ رہی تھی۔ آخر راجو کو نہ پا کر پوچھنے لگی: "راجو گھر میں نہیں؟" ہم نے سوچا ضرور خوش خبری لائی ہے لیکن مزید سوچا کہ اگر اس خوش خبری کا اظہار راجو کی موجودگی ہی پر منحصر ہے تو ہماری خوشی ہی ہو جائے گی۔ جی چاہا کہ کاش ماسی کو بتا سکیں کہ اس موضوع پر ہم سے براہ راست بھی بات ہو سکتی ہے اور یہ کہ اس سے ہماری بے ادبی کا کوئی خدشہ نہیں اور چھوٹی موٹی بے ادبی سرزد ہو بھی گئی تو ہم بہ خوشی برداشت کر لیں گے لیکن یہ سب کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔

آخر ماسی بولی: "کب تک آئے گا؟"

"کون؟ راجو؟ وہ شاید کل تک بھی نہ آئے اس لیے اگر کوئی پیغام ہے تو ہمیں بتا دو، ہم راجو کو پہنچا دیں گے۔"

"پیغام تو ہے مگر؟..."

"ہاں ہاں، کہہ دو، ہم راجو کو آتے ہی بتا دیں گے۔"

"نہیں راجو ہی آپ کو بتائے تو اچھا ہے؟"

"گویا پیغام ہمارے نام ہے؟"

"ہے تو سہی۔"

"کس کا ہے؟"

"موتیا کا۔"

"موتیا؟ کون موتیا؟"

ہم اپنے وقار کو آخری سہارا دے رہے تھے لیکن دانائے ماسی کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا، بولی: "وہی موتیا جس کے لیے شعر پڑھتے رہتے ہو۔"

اب وقار کی حفاظت بے کار تھی۔ ہم نے ماسی کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور کہا: "کیا کہتی تھی موتیا، ماسی؟"

"ہاں اس طرح پوچھو نا!" ماسی کی آنکھ اور زبان میں ایک دانستہ بے باکی نظر آنے لگی۔

ہم نے وہی سوال دہرایا: "اچھا، کیا کہتی تھی؟ بولو بھی ماسی!"

"ڈھولے گاتی تھی۔"

"کس کے؟"

"تمہارے۔"

"سچ؟"

"جان دیتی ہے تم پہ۔"

ہم خوشی سے بے ہوش ہو گئے اور سکینی کلر میں خواب دیکھنے لگ جاگے تو ماسی جا چکی تھی اور راجو سامنے کھڑا ہنس رہا تھا۔ ہمارا اور ماسی باہم نوٹ ملا چکے ہیں۔ راجو نے ہمیں چھیڑنے کی خاطر غیر جانب دار طور پر گنگنانا شروع کر دیا: "پیا ملن کو جانا۔" اس پر ہم نے فوری طور پر فیصلہ کر لیا کہ راجو بہر حال نوکر ہے۔ اب ہمارے محبت کے معاملات میں مشورہ لے گا۔ ہمارا رابطہ براہ راست ماسی مہرو سے قائم ہو چکا ہے چناں چہ اس کے بعد ہم نے راجو سے اپنی گفت گو غیر عاشقانہ باتوں تک محدود رکھی۔ مثلاً جا لاؤ، برتن اٹھا لو وغیرہ۔

ہمیں اب ماسی سے باہمی دلچسپی کے امور پر گفت گو کرنے کی بے

گئی لیکن ماسی مہرو بھی ترسانے کی غرض سے دوسرے روز پھر سے
بالکل نہیں آئی۔

"ماسی! موتیا اور کیا کہتی تھی؟"

کہتی تھی: "اُتے خدا وسدا تلے اِک دُم لمبیے دا۔"

"یعنی ہمارا دم؟"

"نہیں کالے چور کا۔"

"نہیں ہمارا۔" ہم نے ماسی کی اس بے ادبی پر دشت کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں تمھارا نہیں تو اور کس کا؟"

ہمارے دماغ کے مختلف گوشوں میں چھوٹے چھوٹے قہقہے جگ مگا
رہے ہم نے وفورِ اشتیاق میں کہا: "ماسی! موتیا سے کب ملاقات ہوگی؟"

"ملاقات؟ وہ تو نہیں ہو سکتی۔"

"ہوں؟ کیوں نہیں ہو سکتی؟"

"وہ ایسا ہی کہتی تھی۔ کہتی تھی پتہ چل گیا تو گھر والے مار ڈالیں گے۔"

"ماسی! وہ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں مل سکتی؟ میں صرف
اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اسے دیکھنے ہی کو ملاقات کہتے ہیں۔ وہ نہیں ہو سکتی۔"

"ماسی ایک دفعہ اسے کہہ کر تو دیکھو۔"

"کیا کہہ کر دیکھوں؟"

"یہی کہ میری بات سن جائے۔ میں اسے صرف دو لفظ کہنا چاہتا
ہوں نہیں ایک، دو، تین، چار، پانچ۔ بس پانچ لفظ۔" میں نے
کہنے الفاظ دل میں گنتے ہوئے کہا۔

"پھر؟"

"پھر وہ بے شک نہ ملے۔"

"اچھا، دیکھوں گی۔"

"ماسی! اتنے لمبے مستقبل کا صیغہ مت استعمال کرو۔ جو کچھ دیکھنا ہے
جلدی ہی دیکھو اور ہمیں آکر بتاؤ۔" ماسی چل دی۔

ایک دن گزر گیا پھر ایک دن اور گزر گیا لیکن ماسی نظر نہ آئی۔ بھی
ان ہوا اگر بھی عشق کیا ہے تو ہماری بے تابی دل ہمارے اندیشے
اور راز ہمارے وسوسوں اور ہمارے بیم و رجا کا تمھیں کچھ اندازہ ہو
دل اس منزل میں بھوک اور نیند حرام ہو جاتی ہے اور جنگل کی طرف
نکل جانے کو جی چاہتا ہے۔ ہم نے جنگل کا رخ تو نہیں کیا لیکن وہ تمام
باتیں جو عاشق کے نزدیک گھر کے اندر ظاہر ہو سکتی ہیں ہم میں ظاہر
ہوئیں۔

روز غروبِ آفتاب کے وقت ہم غم و محنت سینے سے لگائے
ہوئے بے شک کے بغیر دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔

بتاؤ تو بھلا کون تھا؟

"ماسی مہرو۔" نیاز جھٹ بول اٹھا۔

"اُوں ہُوں۔" چچا نے سر ہلایا۔

"راجو؟" میں نے بتانے سے زیادہ پوچھا۔

"ارے بھائی ماسی اور راجو کا گھر میں آنا بھی کوئی آنا ہے۔" چچا کسی
قدر جوش سے بولے۔ "یہ خود موتیا تھی! ہاں موتیا! اپنی آنکھوں پر اعتبار
ہی نہیں آتا تھا۔ ہمارے گھر میں موتیا! یہ وہ خدا کی قدرت تھی جس کے
متعلق غالب نے شاعری تو کی ہے لیکن غالباً کبھی دیکھی نہ تھی۔ ہم
نے سچ مچ دیکھی اور دیکھتے ہی ہمارے دل کے تار سے نغمہ چھوٹا۔

ع یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔

لیکن جب موتیا کا چہرہ غور سے دیکھا تو ہمارا نغمہ اللہ اکبر ہی پر رک
گیا۔ موتیا کے چہرے پر ہراس تھا۔ اسے کوئی بے پناہ کشش کھینچ تو لائی تھی
لیکن کمرے میں قدم رکھتے ہی جیسے اسے کسی غلطی کا احساس ہوا جیسے اس
کی حیا کی حس بیدار ہو گئی ہو۔ اس کے منہ سے صرف تین الفاظ نکلے
جنھیں وہ غالباً ساری راہ زیرِ لب دہراتی آئی تھی۔

"کیا حکم ہے؟" یہ ہمارے بلاوے کا جواب تھا اور پیشتر اس کے کہ
میں کچھ کہہ پاتا، بولی: "اب میں جاتی ہوں۔" اور دروازہ کھول کر ہوا ہو گئی۔

محبت یا چشم زدن سے کم تر وقت میں آخر ہو گئی تھی۔

باہر نکل کر دیکھا تو موتیا کے پیچھے کوئی آدمی جا رہا تھا۔ کیا اس آدمی
نے موتیا کو نکلتے دیکھ لیا ہے؟ یہ اس کے گھر والوں کو تو نہیں بتائے گا؟ کیا
وہ بے چاری کو ایذا دیں گے؟ میرے دل میں ہزار شکوک ابھرے۔ کوئی دو
گھنٹے بعد میرے دوست اکرم آئے اور بولے: "سنا ہے تمھارے گھر موتیا
آئی تھی۔ ہندو مشتعل ہوئے ہیں۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ فکر مت کرو۔ مولوی عبدالغفور جاں بازوں کی ایک
جماعت لے کر تمھاری حفاظت کو آئے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ کافروں کی کیا
جرأت کہ ہمارے غازی کو چھیڑیں۔"

میرا سر چکرا گیا۔ مجھے ہندوؤں کے اشتعال کی ذرا بھی فکر نہ تھی
لیکن اس خیال سے کانپ اٹھا کہ جملہ جاں بازانِ شہر اپنے غازی کی حفاظت
کو بڑھ رہے ہیں۔ ہماری رسوائی کا اس سے زیادہ عظیم الشان اہتمام اور کیا
ہو سکتا تھا؟ ایک خیال ہمارے ذہن میں رہ رہ کر ابھرنے لگا۔ اپنے بزرگوں

جواں سال جمال احسانی کا دوسرا مجموعۂ کلام

رات کے جاگے ہوئے

قیمت: ۴۰ روپے

پنجاب بک ہاؤس اردو بازار۔ کراچی

کی عزت کا خیال! وہ نہیں گئے تو کیا کہیں گے؟ پھر اپنے شریکوں کی بے
ہے گوئیوں کا خیال! وہ نہیں گئے تو کیا کیا نہ کہیں گے! بے شک عشق کی کیفیت
نہیں لیکن عاشقی میں اناڑی پن بڑی نالائقی ہے اور یہ نالائقی ہم سے ہو
گئی تھی۔ نظیر ہی کا مصرع بار بار کانوں میں گونجتا۔

ع ناموس صد قبیلہ بزیک خمائی تو رفت

ادھر باہر گلی میں چند لونڈوں نے نعرہ بلند کیا: "ہمارا غازی زندہ باد!"
یہ مولوی عبدالغفور کے بیٹے کا نابالغ ہراول تھا۔

میں نے اکرم سے کہا: "اکرم! جاؤ، مولوی صاحب کو روکو اور
انھیں کہہ دو کہ موتیا کی کہانی کسی دشمن کی ہرزہ سرائی ہے اور افواہوں پر کان
دھرنا شرعاً بھی روا نہیں۔ اور ہاں یہ بھی پتہ کرلانا کہ موتیا کس حال میں ہے۔"
اکرم بولا: "اگر موتیا کی کہانی محض افواہ ہے تو اس کا حال پوچھنے
کی بے تابی کیوں؟"

"بھئی، سمجھتے کیوں نہیں، یہ افواہ تمھارے لیے نہیں، مولوی صاحب
کے لیے ہے۔ انھیں روکو اور موتیا کی خبر لاؤ۔"

تھوڑی دیر بعد اکرم مولوی صاحب کی کامیاب ناکابندی کرنے کے
بعد لوٹے اور بمشکل یہ مبارک خبر سنا ہی چکے تھے کہ ملک کھیا خان تشریف
لے آئے اور ابتدا ایک پُرجوش مبارک باد سے کی۔ مبارک باد کی شکن نزول
پوچھی تو بولے: "تم نے مسلمانوں کی عزت رکھ لی۔"

شانِ نزول فوراً سمجھ میں آگئی۔ ملک صاحب کے گنوار پن کی یہ
بہت دبیز تہہ تھی لہٰذا عافیت اسی میں تھی کہ ان کے ساتھ بحث کے بجائے
اتفاق کرلیا جائے۔ عرض کیا: "ملک صاحب! یہ خاک سا کس قابل ہے۔ بس
تمنا تھی کہ کوئی خدمت اسلام کرجاؤں سو کردی۔"

"شاباش! اس کا اجر تمھیں خدا دے گا۔"

"کاش یہ سعادت میری جگہ آپ کے حصے میں آئی ہوتی۔"

"تم دعا کرو۔" یہ کہتے ہوئے مجھے ایک رازدارانہ آنکھ ماری۔

میں ملک صاحب کو دیکھتا اور سوچتا کہ کیا انسانی دماغ احساسات
لطیف سے اس قدر عاری بھی ہوسکتا ہے؟ لیکن کتنے آدمی ہیں جو یہ کمی محسوس
کرتے ہیں؟ کسی کو جسمانی خراش آجائے تو ہماری تعزیرات میں اسے ضرب
شدید کہتے ہیں لیکن ذہنی چوٹ کا تعزیرات میں کہیں ذکر ہی نہیں حالانکہ
سنگین ترین جرم وہ بدنی زخم نہیں جو تیز دھار آلے سے آتا ہے بلکہ وہ
ذہنی گھاؤ ہے جو گندی زبان سے واقع ہوتا ہے۔

آخر مبارک باد کا فریضہ ادا کرنے کے بعد ملک صاحب رخصت
ہونے لگے۔ میں نے گہری سانس لی اور بستر پر اس کے کراہت کا مارا کوئی اور
قدر ان مبارک باد کا بوجھ ہلکا کرتا۔ میں نے دروازہ بند کیا کے چٹخنی لگا کر
دی اور بستر پر دراز ہوگیا۔ لیکن نیند کہاں؟ وہی دل جو چند ساعت پہلے گرہ
گاہ خیال سے دماغ تھا، اب گوناگوں وسوسوں کی آماجگاہ تھا۔ کہیں
ظالم اس بے چاری کو ستا نہ رہے ہوں لیکن آخر اس کا جرم کیا ہے؟
اس نے فقط ایک لمحے کے لیے میرے کمرے میں جھانک کر دو لفظ ہی تو
کہے تھے اور اگلے لمحے غائب ہوگئی تھی۔ کیا کسی سے بات کرنا جرم ہے؟
وہ مجھ سے کسی سے بات نہیں کرتے؟ نہیں، وہ موتیا کو کچھ نہیں کہیں گے۔

دوسرے دن کالج میں چھٹی تھی۔ صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ موتیا کے
باپ کو اشتعال ضرور آیا تھا لیکن اس نے خاموشی سے قصبے کے پرنسپل سے بار
شکایت کی اور میرے تبادلے کا مطالبہ کیا۔

کوئی دوپہر کا وقت تھا کہ چپراسی پرنسپل صاحب کا سلام لے کر آیا۔
پرنسپل صاحب میرے قریب ہی رہتے تھے۔ خوش مزاج آدمی تھے۔ "مولانا"
زیادہ مسکرا کر کہتے اور ابتدائی علیک سلیک کے بعد ہماری گفت گو شروع ہوتی
"لالہ لوڑ نیداں" کہتے ہیں کہ کل ان کی لڑکی تمھارے مکان پر گئی تھی۔

"جی ہاں، ٹھیک کہتے ہیں۔"

"کیسی لڑکی ہے؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"خوب صورت ہے؟"

"جی ہاں، بہت۔"

"کس لیے گئی تھی؟"

"ایک بات سننے کے لیے۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے بلا بھیجا تھا۔"

"کیا بات کہنا تھی؟"

"مجھے تم سے محبت ہے۔"

"پھر کہہ دی؟"

"کہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ آئی اور چل دی۔"

"اُسے بھی تم سے محبت ہے؟"

"آثار تو ایسے ہی ہیں۔"

"شادی کرلوگے؟"

"دل و جان سے۔"

"مگر تم مسلمان ہو۔"

"جہاں گیر بھی مسلمان تھا۔"

"مگر وہ بادشاہ بھی تھا۔"

"یہ معمولی سی کمی ضرور ہے۔"

پرنسپل صاحب ہنس دیے اور بولے: "یہ کمی تو شاید مستقبل
میں پوری نہ ہوسکے۔ خیر، چائے تو پیو۔"

Https://www.facebook.com/groups/3726056771789 45/

پرنسپل صاحب پر ولایت کی تعلیم نے نہایت سخت منداثر کیا تھا۔ چائے پینے کے دوران کہنے لگے: "اماں جی تمھارے تبادلے پر مجھے ہیں لیکن مجھے یہ نہیں بتا سکتے تمھارا قصور کیا ہے۔ کل کسی نیک بخت نے میرے کان میں جھانک لیا تو میرے تبادلے کا تقاضا ہونے لگا اور اگر اس پھرتی سے تبادلے شروع ہو گئے تو گورنمنٹ کے کان پھٹنے سے پہلے میں اماں جی کو بھجوا دوں گا۔"

پرنسپل صاحب کی ملاقات تو سب معمول خوش گوار تھی لیکن ہمارا دل ہمارے دماغ کی طرح نہایت شکستہ حالت میں تھا۔ اب وہ گھڑی آ گئی تھی جس سے موتیا کل کترتی گزرتی تھی۔ موتیا کو سلام بھیجنے کی حسرت تھی لیکن اب پیام بری کون کرتا؟ ماسی روپوش ہو چکی تھی اور راجو کی ماں تک رسائی نہیں تھی۔

تیسرا دن تھا۔ پچھلے پہر صحن میں بیٹھا تھا کہ دروازے سے ایک ادھیڑ عمر کی باوقار سی خاتون داخل ہوئی۔ قریب آئی تو میں تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ خاتون کسی تمہید کے بغیر بولی: "بیٹا! مجھے پہچانتے ہو؟"

"نہیں۔" میں نے کسی قدر معذرت کے لہجے میں کہا۔

"میں موتیا کی ماں ہوں۔"

ایک لمحے کے لیے میرا دماغ جواب دے گیا۔ ذرا سنبھلا تو کرسی پیش کی لیکن اس نے کرسی پر توجہ نہ دی۔ میرے منہ سے نکلا: "موتیا تو خیریت سے ہے؟"

"موتیا کی خیریت کی بہت فکر ہے؟"

"مجھے ڈر تھا آپ اسے ایذا نہ پہنچائیں۔"

"ہم اور موتیا کو ایذا! موتیا ہماری بیٹی ہے۔"

"شکر ہے۔"

"لیکن کچھ اس ایذا کا بھی خیال ہے جو موتیا کے ماں باپ کو پہنچی ہے؟"

اس فقرے پر میں نے چونک کر دیکھا تو موتیا کی ماں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ گلے میں اس کی ہچکیاں آنسو تھام سکیں اور ایک گہرے کے عالم میں اس کے منہ سے نکلا: "کاش میری بیٹی اکلوتی نہ آئی ہوتی۔"

میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ میری زبان گنگ تھی۔ مجھے اس وقت تک اگر کسی کی رسوائی کا خوف تھا تو وہ اپنی اور اپنے خاندان کی رسوائی تھی۔ موتیا اور اس کے ماں باپ کی بدنامی میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ اب میرے کانوں میں نظیر کی کا پورا قطعہ گونجنے لگا جو مجھ سے زیادہ موتیا پر صادق آتا تھا۔

رفتی بہ بزم غیر بنگو نامی تو رفت — ناموس صد قبیلہ بیک خامی تو رفت
اکنوں اگر فرشتہ نگوید بہشت رو — در شہر صد حکایت بدنامی تو رفت

میں اسی سوچ میں تھا کہ موتیا کی ماں چل کھڑی ہوئی۔ چلتے چلتے میری طرف دیکھا اور ایک کرب انگیز لہجے میں کہا: "بھر میں موتیا کو لے کر اور جب تک تم یہاں موجود ہو رہے گا۔"

میں نے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کہا: "آپ اطمینان رکھیں۔ شام سے پہلے یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

موتیا کی ماں کا چہرہ کھل اٹھا۔ دروازے سے نکلتے نکلتے وہ مجھ سے کہنے لگی: "بیٹے رہو بیٹا! بھگوان تمھارا بھلا کرے۔"

کوئی گھنٹہ بھر بعد میرے دوست اکرم آئے اور آتے ہی بولے: "تمھارے گھر موتیا کی ماں آئی تھی اور تم نے بندوق سے صلح کر لی۔"

"پھر؟"

"مولوی عبدالغفور بڑے مشتعل ہو رہے ہیں۔ تمھارے خلاف فتویٰ دینے والے ہیں۔"

"میرا قصور؟"

"موتیا کے پاس چشم دید شہادت پہنچی ہے کہ موتیا کی ماں کو تمھارے گھر کے دروازے پر دیکھا گیا اور تمھیں دعا دیتے سنا گیا۔"

"دعا دینا کب سے گناہ ٹھیرا ہے؟"

"میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ باہر دروازے کے پاس سے گزرتے چند لونڈے یک زبان ہو کر بولے: "ہمارا نمدار۔ مردہ باد۔"

دوست روز ہم بالا پور سے اپنی درخواست پر تبدیل ہو کر ایک دوسرے شہر میں پہنچ گئے اور فتوے کی زد سے نکل گئے۔ وہاں دو دن ہی گزرے تھے کہ ہمارے نام ایک اجنبی خط آیا۔ کھول کر دیکھا تو فقط اتنا لکھا تھا: "پردیسی مال نہ لینے یاری توڑی لکھ سونے نہ ہوئے۔ (پردیسی مال سونے کا ہو تو اس سے محبت مت کیجیو۔)"

یہ موتیا کا خط تھا جہاں فتوا نہ پہنچ سکا تھا عشق پہنچ گیا۔ موتیا محبت کو بنا بر خاندان کی بدنامی کا احساس نہیں تھا۔ میرے پہلو میں دل تھا بے اختیار بھر آیا۔ چاہا کہ جواب میں اسی شعر کا دوسرا مصرع لکھ بھیجوں اور بھیجا چیر کر کاغذ پر رکھ دوں۔ ع

"پر اک گلوں پہ پردیسی چنگا نہ بیاہ کرے تاں رووے۔" میں ایک طرح پردیسی ہی اچھا ہے کہ یاد کرتا ہے تو رو دیتا ہے۔

لیکن قلم اٹھایا تو ایک بے بس ماں کی روتی آنکھیں سامنے آ گئیں اور قلم رکھ دیا۔ ہم تینوں نے دیکھا تو چچا کی اپنی آنکھیں بھی نم ہو چکی تھیں۔ ہم خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔